Vol.4No.1 2021

ISSN Online: 2709-7625

ISSN Print: 2709-7617

اکیسویں صدی کی اردو نظم میں تصوّرِفنا اور موت

راؤ محمد عمر[1]

ڈاکٹر شائستہ حمید خان[2]

نمرہ حنیف[3]

ABSTRACT

Twenty fiirst century's poem depicts great tendencies towards dark shades of death and miseries of mortality. The social, economical and political condition of Pakistan in these last two decades impacted the sense of fear and meaninglessness upon the citizens. Terrorist attacks, suicide bombing, war on terror and natural disasters like floods and earthquakes amplified the theme of death and feeling of being mortal among people, so this fear can be seen in people's daily routine life and writings of this era. Poems written in this era shows great interest in pessimistic themes and fear of death and mortality is one of the major themes of these poems.

ازل تا حال ، انسان کو درپیش مسائل میں سے سب سے بڑا اور بنیادی مسئلہ اس کی فنائیت کا ہے۔ اپنی دلی خواہش اور لاکھ کوششوں کے باوجود وہ اپنی بقا کو یقینی بنانے میں ناکام رہا ہے۔ فنائیت کا یہ مسئلہ کسی ایک دور اور کسی ایک مخصوص خطے تک ہی موقوف نہیں ہے ۔ یہ ایک آفاقی اور ازلی حقیقت ہے جسے جھٹلانا ناممکن ہے۔ وہ شروع دن سے ہی ان تمام چیزوں کو پوجتا آیا ہے کہ جن سے اسے فنا کا خطرہ لاحق رہا ہے، یا پھر ان چیزوں کی پرستش کرتا رہا ہے جو اس کی زندگی ، اس کے جیون کو برقرار رکھنے کے لیے ناگزیر رہے ہیں۔سورج، چاند، ستاروں ، آندھیوں، بارشوں اور درندوں کی مورتوں کی پوجا کے پیچھے یہی عوامل کارفرما تھے، کیوں کہ دیکھا جائے تو فنا اور موت ہی وہ آخری بدترین خوف ہے کہ جو کسی انسان کو لاحق ہوسکتا ہے اور اسی خوف اور ڈر کو ختم کرنے اور بقا حاصل کرنے کے لیے وہ ازل سے مجسم جستجو اور جہدِ مسلسل کی تصویر ہے۔

پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور[1]

اسسٹنٹ پروفیسر، جی سی یونیورسٹی، لاہور[2]

پی ایچ ڈی اسکالر، جی سی یونیورسٹی، لاہور[3]

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

یہاں یہ بقا دو قسم کی ہے ،ایک دائمی بقا کہ جہاں وہ فنا کی تمام ممکناتوں کو شکست دے کر امرہو جائے اوردوسرا کسی نامعلوم اور ممکنہ وقت تک اس بقا کے دورانیے کو بڑھا سکے۔ اپنی ابتدائی حالتوں میں انسان اس مذکورہ بالا دوسری قسم کے لیے کوشاں رہاہے۔ جس کے لیے اس نے جنگیں لڑیں، وسائل حاصل کیے، خطرات پر قابو پایا، علاج دریافت کیے اور زیادہ عرصے تک زندہ رہ سکنے کی ممکنات کو بڑھایا۔ مگر نسبتاً ایک بہتر تہذیبی و تمدنی اور شعوری حالت پر آ کر اس نے دائمی بقا کے لیے کوششیں شروع کیں۔ کبھی اس نے کلوننگ (Cloning) کے ذریعے اپنے مادی جسم کو محفوظ کرنے کی کوشش کی تو کبھی اس نے مختلف تجربات کے ذریعے فناکی ممکناتوں کو تسخیر کرنے کی کوشش کی۔ یہاں یہ امر کافی دلچسپ ہے کہ جب اس نے کلوننگ (Cloning)کے ذریعے اپنے جیسے ہم شکل اور ہم خواص جسم تخلیق کرنے کی کوشش کی تو اسے احساس ہوا کہ کلون شدہ جسم یا انسان وہ خود نہیں ہوگا، کیوں کہ اس کا وجود فقط مادی جسم سے بڑھ کر کچھ اور بھی ہے۔ وہ اپنے تجربات ، یادداشتوں ، معروض، مخصوص حاصل شدہ شعور اور واقعات کی وجہ سے اس نہج تک آیا ہے۔ سو اس نے کلوننگ کے ساتھ ساتھ یادداشت اور حاصلات کو بھی اس کلون شدہ جسم میں منتقل کرنے کی کوششیں شروع کیں ۔ یہاں یہ امر تصورِ فنا اور موت کو سمجھانے کے لیے بہت اہم ہے کہ موت فقط اس مادی جسم کی بے ہیئتی، فنائیت اور شکست وریخت کا نام نہیں ہے، بلکہ موت تو اس داخلی جہان کی فنائیت کا نام ہے کہ جو اپنے ہونے کے شعور ، احساسات اور جذبات کا امین ہے۔اپنی دلی خواہش اور صد ہزار تدبیروں کے باوجود ، ہنوز انسان خود کو امر بنانے میں ناکام رہا ہے۔ سو وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے اس احساس کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر یہ ایک ایسا احساس ہے جو کہ اس کی ذات کی گہرائیونمیں کہیں موجود ہے۔ بلیز پاسکل (Blaise Pascal) اپنی کتاب ‘‘Pensees’’ میں موت پر بات کرتے ہوئے لکھتا ہے:

‘‘Being unable to cure death, wretchedness and ignorance, man has decided, In order to be happy, not to think about such things.(1)’’

وجود اپنی انفرادیت کے سبب فنائیت کے اس احساس کو خود ہی برداشت کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ہر فرد یاوجود اپنی موت کا سامنا خود ہی کرتا ہے۔ گو اسے ایک عالمگیر اور آفاقی حقیقت کہا جا سکتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ دراصل ایک انفرادی واقعہ ہے چاہے لاکھوں افراد اجتماعی طور پر لقمۂ اجل بن جائیں پھر بھی یہ ہر اکائی (کہ جس سے مل کے لاکھ ہوئے) کا ذاتی اور انفرادی نوعیت کاتجربہ ہے۔

موت کے اس ذاتی احساس اور تجربے کے ساتھ ساتھ موت کا دوسرا پہلو بھی جو فرد کو متاثرکرتا ہے، انتہائی جاں فرسا اور تکلیف دہ ہے اور وہ پہلو ہے فرد کے قریبی افراد کا لقمۂ اجل بن جانا۔ انسان بطور حساس وجود اور صاحبِ جذبات و احساسات اپنے ارد گرد کے لوگوں اور رشتے داروں سے مانوس ہو جاتا ہے اور تمام عمر تعامل پذیر رہتا ہے۔ سو ان کی جدائی اوردوری کا احساس جہاں اس کے تصورِ فنائیت کو تازہ اور مہمیز کرتا ہے، وہیں اسے محرومیوں کا احساس دلاتا ہے۔

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

سیمون ڈی بوار (Simone De Beavoir)اپنی کتاب ''A Very Easy Death'' میں اس امر کو یوں بیان کرتا ہے:

''The misfortune is that although everyone must come to [death], each experiences the adventure in solitude. We never left maman during those last days.....and yet we were profoundly separated from her.(2)''

موت کی یہ دوسری جہت فرد کو محدودیت کا احساس دلاتی رہتی ہے۔ گو کہ یہ محدودیت ایک خارجی نوعیت اختیار کیے ہوئے ہے مگر پھر بھی یہ وجود کے انتخاب پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا باطنی اور داخلی جہان ان حادثات کا اثر قبول کرتا ہے۔ وہ دوسروں کی جدائی پر اشک بہانے کے ساتھ ساتھ اپنی فنا کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کر ماتم کناں رہتا ہے۔ غالبؔ اس صورتحال کو کچھ یوں بیان کرتا ہے:

موت کا ایک دن معین ہے

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

غالب نے ایک اور جگہ پر اسی خیال کو ایک اور زاویے سے پیش کیا گیا ہے:

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا

اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

اس عمومی تصور سے ہٹ کر دیکھا جائے تو تصورِ موت ، رجائی اور قنوطی دونوں قسم کے نظریات پر مبنی ہے۔ یہ تقسیم دراصل مذہبی اور غیر مذہبی فلاسفہ کے خیالات اور نظریات کی مظہر ہے۔ مگر اس مذہبی اور غیر مذہبی تفریق کے علاوہ بھی وجودی فلسفیوں کے ہاں تصورِ موت سے متعلق تضادات اور اختلافات پائے جاتے ہیں۔کرکیگارڈ کے نزدیک موت مستقبل میں پیش آنے والا کوئی خارجی واقعہ نہیں بلکہ یہ وجود کی داخلیت کا لازمی جزو ہے۔ موت کا مقررہ وقت کوئی نہیں جانتااس لیے اس کی ناگہانیت مجھے اس قابل بناتی ہے کہ میں ایسے فیصلے لوں کہ جنہیں عملی جامہ پہنانے سے پیشتر موت مجھے دبوچ نہ لے۔ ہائیڈیگر کے مطابق انسان موت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے اور جب تک زندہ رہتا ہے، موت سے ہم آہنگ رہتا ہے:

"Dasaein Dies as long as it exists."(3)

ہائیڈیگر اسے ''وجود برائے مرگ (Being for Death) ''کہتا ہے اور موت اس کا نہایت شخصی ، اٹل اور عظیم امکان ہے۔ یہ اس کے دنیا میں نہ ہونے کا امکان ہے۔ ہائیڈیگر کے ہاں موت فکر(Care)کے ساتھ منسلک ہے اور یہ فکر امکان، واقعیت اور ہبوطیت کے ارکانِ ثلاثہ پر مشتمل ہے۔ موت جو کہ مستقبل کے ایک امکان کے طور پر وارد ہوتی ہے اور باقی تمام امکانات کو ہڑپ کر

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

جاتی ہے۔فکر کا دوسرا رکن واقعیت ہے ، جس سے مراد ہے انسان کا اپنے دنیا میں پھینکے جانے کو قبول کرناہے۔ انسانی وجود بطور واقعہ(Fact) امکانات سے وابستہ ہے۔ لہٰذاموت کوئی اتفاقی امکان نہیں ہے بلکہ ایک اٹل امکان ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ ہبوطیت جو کہ فکر کا تیسرا رکن ہے؛انسان کہ جسے اس جہانِ خراب میں پھینک دیا گیا ہے، وہ دنیاکے ہجوم میں اپنی انفرادیت کو گم کرنے کے لیے کوشاں رہتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ وہ وجود برائے مرگ ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ابھی موت کے متعلق سوچنے کی ضرورت نہیں ۔ یہ موت کا غیر شخصی تصور ہے لیکن یہی موت اگر انسان کی داخلیت کا ترکیبی جزو بن جائے تو وہ خوشی سے دوڑ کر موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ خود کشی کی صورت میں نہیں بلکہ موت کے شعور کے ساتھ جی کر اوراپنے تمام امکانات کو اس عظیم امکان سے مربوط کر کے۔ مگر سارتر کے نزدیک موت انسانی داخلیت کا جزو نہیں ہے۔ یہ ایک سراسر لغو (Absurd)اورخارجی صورتحال ہے۔ یہ انسان کا امکان نہیں ہے۔ یہ اس کے امکانات کے دائرے سے باہر ہے جو تمام امکانات کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ یہ انسان کی دشمن ہے مگر شعوری حالت میں اسے شکست نہیں دے سکتی ۔ انسان چاہے بھی تو موت اس کی مرضی کی تابع نہیں، مگر جب چاہے اسے ابدی نیند سلا سکتی ہے۔ اس لیے سارتر خود کو آزاد فانی کہتا ہے۔ جیسپرز کے مطابق موت ایک شخصی واقعہ ہے ۔ وہ انسان کی نہ تو دوست ہے اور نہ ہی دشمن۔جب کہ نطشے موت کو رجائیت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کے مطابق موت کے بغیر زندگی کی حقیقی لذتوں سے محظوظ نہیں ہوا جا سکتا۔

‘‘As Everyone knows, there are insects which die in the moment of Fertilization. Thus it is with all Joy: Life's spreme and most voluptuous moment of pleasure is attendend by death. (4)’’

اس طرح نطشے کے ناول ”Thus Spoke Zarathustra“ کا کردار ’’زرتشت‘‘ کہتا ہے:

‘‘Many dies too late and some die too early. Yet strange soundeth the percept: Die at the right time! To be sure, he who never liveth at the right time, How could he ever die at the right time? Would that he might never be born! (5)’’

ترجمہ: (بہت سے (لوگ) بہت دیر سے مرتے ہیں اور کچھ بہت جلدی مر جاتے ہیں۔ ابھی یہ رواج (اصول)عجیب لگتا ہے کہ صحیح وقت پر مرا جائے۔۔یقین کیجیے وہ جو کبھی صحیح وقت پر زندہ نہیں رہتا، وہ کبھی صحیح وقت پر کیسے مر سکتا ہے؟ اس سے اچھا تو وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔)

صحیح وقت پر جینے اور صحیح وقت پر مرنے سے نطشے کی مراد وہ آزادی، قوتِ ارادی ، فیصلگی اور آزادنہ انتخاب ہے کہ جو وجود کو اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے اور اسی طرح سے وہ اپنے ہونے سے حقیقی طور پر حظ اٹھا سکتا ہے اور لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ بہر حال موت کا تصور رجائی ہویا قنوطی، دونوں میں ہی ایک خاص قسم کی کسک دیکھنے کو ملتی ہے۔ بے اعتباریت ،

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

فنائیت اور منظر سے غائب ہو جانے کا یہ احساس زندگی بھر انسان کی ذات سے جڑا رہتا ہے۔ اس احساس کو جون ایلیا بڑے خوبصورت انداز میں بیان کرتے ہیں:

کتنی دلکش ہو تم کتنا دلجو ہوں میں

کیا ستم ہے کہ ہم لوگ مر جائیں گے

فرد کو درپیش مسائل میں سے ایک بنیادی مسئلہ موت اور فنائیت کا احساس ہے۔ جس کا ادراک اسے اپنے بچپن کے ابتدائی چند سالوں میں ہی ہو جاتا ہے۔ وجودی فلسفیوں کے نزدیک انسان پیدا ہوتے ہی موت کے لیے خاصا معمر ہوجاتا ہے، یعنی موت کا ظہور زندگی کے ساتھ ہی ہو جاتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ فرد اپنے معروض کی بے ثباتی اور عارضیت سے اس کا شعور اوائل عمری میں ہی حاصل کر لیتا ہے۔ یہ ایسا احساس ہے جو شعوری اور لاشعوری طور پر ہمیشہ اس کی سوچوں اور خیالات پر حاوی رہتا ہے۔ وہ اپنے اس فناپذیری کے احساس اور خدشات کو زائل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ وہ دنیا کے کاموں اور روز مرہ کے معمولات میں مگن رہتا ہے تاکہ وہ ان خیالات سے فرار حاصل کرسکے۔ مگر گردو پیش میں رونما ہونے والے حادثات وواقعات اس کے تسلسل کو توڑ دیتے ہیں۔ وہ جب کسی عمل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اپنی موت کے اس امکان کا احساس ہوتارہتا ہے جو اس کے تمام امکانات ، عزائم اور مستقبل کے خوابوں کو ہڑپ کر سکتی ہے، کیوں کہ یہ فرد کے امکانات کی حد ہے۔ موت کی اس عالمگیر حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے فرد اسے کبھی رجائی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے تو کبھی مذہبی نظریات کی نگاہ سے، مگر اس کے باوجود یہ فنائیت کا احساس، اس منظر نامے سے اچانک غائب ہو جانے کا خیال اسے کسی نہ کسی صورت بے کلی اور اضطراری جیسی کیفیات میں مبتلا کیے رکھتا ہے۔ دوسرا اس عارضی پن کے ساتھ ہونے والی جسمانی شکست وریخت کا عمل ،امراض اور بیماریاں تکلیف کے ساتھ ساتھ تازیانے کی طرح اس کے اس احساس کو مہمیز کیے رکھتی ہے، کیوں کہ موت ایک قاصد کی طرح کسی بھی وقت حکمِ اجل لیے مکانِ زیست کے دروازے پر دستک دے سکتی ہے۔ موت کی اسی ناگہانیت کوستار سیّد کی نظم ’’ موت قاصد کی طرح آتی ہے ‘‘ میں کچھ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے:

موت قاصد کی طرح آتی ہے

خواب و خواہش کوختم کرتی ہوئی

الوداعی خطوط تھامے ہوئے

موت قاصد کی طرح آتی ہے--- (6)

موت کی یہ اٹل حقیقت فرد کی فنا پذیری کے احساس کے ساتھ اسے بے یقینی کی حالت سے بھی دوچار کیے رکھتی ہے۔ وہ نہیں جانتا کہ کس وقت اسے پروانۂ اجل پکڑا دیا جائے اور رخصت کا

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

حکم دے دیا جائے ۔ مذہبی خیالات کے حامل فلسفیوں کے نزدیک ہر چیز، ہر عمل ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کارفرما ہے مگر فرد اس متعین وقت اور لمحے سے بے خبر ہے۔ یہ ایک ایسا فرمان ہے جس سے انکار اور فرار ممکن نہیں۔ اسی وجہ سے سارتر اسے لغو حقیقت گردانتا ہے۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس پر حیل وحجت سے کام نہیں لیا جا سکتا اور نہ اس پر نظر ثانی کی کوئی گنجائش ہے۔ یہ وہ حقیقی فاتحِ عالم ہے جسے لاکھ تدابیر اور کوششوں سے بھی نہیں ہرایا جا سکتا۔فنائیت اور بے ثباتی کے احساس میں ڈوبی ہوئی ڈاکٹر سعید اختر درانی کی نظم '' خزاں '' سے ایک اقتباس درج ذیل ہے:

---ہاں بجا ہے یہ سب کچھ، ہاں چمن تو جاگے گا

جب بہار آئے گی، برگِ گل ہرے ہوں گے

اور پھر سے پہنیں گے پیڑ اک نئی پوشاک

ہاں، شباب آئے گا پھر سے ان درختوں پر

پھر وہ لہلہائیں گے، پھر وہ بارور ہوں گے

لیکن آہ انساں کی یہ نہیں ہے کیوں تقدیر

پھر شبابِ رفتہ کو میں کبھی نہ پاؤں گا

میرے نخلِ ہستی پر آئے گی خزاں اک بار

اور اس خزاں کے بعد میں بہار سے محروم

تا ابد نہ پاؤں گا برگ وبار دوبارہ

موت کے شبستاں میں سو کے پھر نہ جاگوں گا

آہ کیوں فقط اک بار ہے خزاں مری تقدیر؟ (7)

اردو ادب میں بہار اور خزاں کا استعارہ عموماًخوشی اور دکھ، رونق اور ویرانی، جوانی اور بڑھاپے وغیرہ کے لیے مستعمل ہے مگر درج بالا نظم میں اس کے ذریعے موت اور زندگی کی رمز بیان کی گئی ہے کہ دیگر امکانات کے برعکس موت ایک ایسا مکان ہے جسکا چناؤ ہم اپنی مرضی سے نہیں کرتے۔ یہ ہماری تمام ممکناتوں کو روند دیتی ہے۔ درخت، شجر، پودے اور پھول خزاں کے بعد پھر سے کھل جاتے ہیں، ہرے ہو جاتے ہیں۔ ان سے دوبارہ زندگی کی کونپلیںپھوٹ نکلتی ہیں، مگر آدمی جب ایک دفعہ فنا آشنا ہوجاتا ہے تو اس کی زندگی کسی بہار کے ساتھ مشروط نہیں ہوتی۔ یہ فنا مستقل فنا ہے اور یہ وجود مستقل فانی۔ جو مٹی کے کوزے کی طرح ہاتھ سے گرتا ہے یا ذرا سا کسی

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

چیز سے ٹکراتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے۔ نظم '' کوزہ گر کی مٹی '' میں منیب الرحمن خود کو جامِ سفالیں سے تشبیہ دے کر زیست کی ناتوانی اور عارضیت کا اظہار ان لفظوں میں کرتے ہیں:

کوزہ گر کی سیاہ مٹی سے

تو نے اک دن مجھے بنایا تھا

میں وہی ساغرِ سفالیں ہوں

ہاتھ سے گر کے ٹوٹ جاؤں گا

میں تیری کائنات کے اندر

ایک ناچیز ذرۂ خاکی (8)

فرد جونہی ہستی عالمِ فانی میں ظہور پاتا ہے، اس کے لیے موت کا امکان ناگزیر ہوجاتا ہے۔ موت کی اس اٹل حقیقت کو امکان کہنے سے مراد ہے کہ وجود اس کا حتمی وقت نہیں جانتا لہٰذا وہ ہر لمحہ ہر آن اس امکان سے روشناس اور نبردآزما رہتا ہے۔عالمِ حادثات میں یہ حادثہ اور اس کی ہار بالآخر طے ہے۔ کب ، کہاں اور کس طرح یہ وہ سوالات ہیں کہ جن کا جواب دینے کے لیے وہ خود زندہ نہیں بچتا۔ وہ باڑمیں مقید کسی بیل کی طرح تمام عمر فنا کی حد بندی میں بھاگتا پھرتا رہتا ہے اور بالآخر کسی لمحۂ نامعلوم میں اسی باڑ سے سر ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے۔وہ ایک ایسی کہانی کے مانند ہے جس کا کردار بھی وہ خود ہی ہے ، مصنف بھی اور قاری بھی۔ وہ اپنی کہانی کے علاوہ دوسروں کی کہانی میں فقط ایک اضافی کردار کے طور پر موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنی کہانی میں بھی وقت کا قیدی ہے ۔ اس کا ہر لمحہ زماں کی عارضیت کا غلام ہے۔ وہ ہرلمحہ خود کو ان کی غلامی سے آزاد کروانے کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ جونہی کسی لمحے کی قید سے نکل کر آگے بڑھتا ہے، اپنا کچھ حصہ ماضی کی زنجیروں میں جکڑا چھوڑ آتا ہے۔ وہ اپنا آپ پیچھے چھوڑتا بڑھتا چلا جاتا ہے اور بالآخر وہ پچھلے لمحاتی پڑاؤ سے جست لگاتا اگلے لمحاتی پڑاؤ تک نہیں پہنچ پاتا اور عدم کی گہرائیونمیں گرتا چلا جاتا ہے۔ مگر یہ دوہرا المیہ ہے کہ فرد کسی نہ کسی انداز میں ہر لمحہ اپنی فنا اور موت کے تصور سے باخبررہتا ہے۔ یقیناً دنیا کے تمام دکھوں اور غموں میں کم یا زیادہ، واضح یا پوشیدہ طور پر فنا اور موت کی شیڈ ضرور موجود ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ موت سے بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ موت کی یہ ٹک ٹک کرتی گھڑی اس کے ساتھ ساتھ ہی چلتی رہتی ہے ۔ اسی لیے اس کا خیال بھی اسے سدا بے چین کیے رکھتا ہے۔موت کے اسی اٹل امکان اور حقیقت کی عکاسی شمامہ افق کی نظم '' موت تمہارے اندر ہے '' میں یوں کی گئی ہے:

موت سے بھاگ کر تم کہاں جاؤ گے

موت سانسوں میں ہر دم رواں ہے

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہوا میں، گھٹا میں

تمازت، طراوت میں ہر سو فضا میں

زمیں پر، خلا میں

موت سے بھاگنے کی دلیلیں نہ دو

زندگی کو امر کر کے دیکھو

اذیت کی گہرائی ناپو

ذرا دیر کو مر کے دیکھو

تمہیں موت اچھی لگے گی

موت مرنے پہ پھولے سماتی نہیں

موت ہنستی نہیں مسکراتی نہیں

موت روتی نہیں

موت چپ چاپ اندر پڑی رہتی ہے،

دور جاتی نہیں

موت سے بھاگ کر تم کہاں جاؤ گے! (9)

انس انسان کی صفتِ غالب ہے جس کے سبب وہ پیہم اور دائم، تاوقتِ اجل اپنے گردو پیش اور معروض کے ساتھ مانوس ہوتا ہے۔ اسی انس کے سبب اس کا داخل و باطن مٹی کے ڈھیلوں سے بنے مکان ، گلی محلے اور اس کے گردوپیش میں بسنے والے دیگر انسانوں سے احساس کی سطح پر جڑا ہوتا ہے۔ وہ اپنے حال میں بھی ان سے جذباتی رغبت رکھتا ہے اور اس کا ماضی بھی ان چیزوں کے تصورات کاحامل ہوتا ہے۔ اس پیچیدہ امر کی تفہیم کے لیے کسی افسانے یا ناول کے پلاٹ کی مثال دی جا سکتی ہے۔جس میں کردار کسی خاص زمان و مکان میں اختتام کی طرف بڑھتے ہیں۔ اس افسانے یا ناول میں سے اس خاص ماحول اور گردو پیش (زمان و مکان) اور دوسرے کرداروں کو نکال کر فقط ایک کردار کو لے کر آگے بڑھا جائے تو اس میں سوائے کامل نیستی کے بھلا اور کیا بچے گا؟ حقیقی زندگی میں فرد اپنے گردو پیش اور معروض سے شعور حاصل کرتا ہے۔ سرسری و سطحی مشاہدے سے لے کر عمیق مشاہدے تک کے سفر میں وہ زبان، ابتدائی معلومات اور خام نظریات اپنے گزشتگان اور اردگرد کے لوگوں سے حاصل کرتا ہے اور دوسری طرف جس چیز کا وہ مشاہدہ کرنے کی کوشش کرتا ہے ، وہ بذاتِ خود اس کا معروض ہی ہے ۔ لہٰذا کہانی کہنے والا خود کسی کہانی کا حصہ

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہو کر اس سے شعور حاصل کرتا ہے اور اگر وہ خود کسی کہانی کا حصہ نہ ہو تو وہ بذاتِ خود ایک مکمل نیستی ہے۔ اس کا شعور مختلف مشاہدات ، تجربات اور معلومات سے ترتیب پاتا ہے۔ لہٰذا جب اس کا کوئی قریبی سوئے عدم روانہ ہوتا ہے تو اس کا احساساتی نظام اتھل پتھل کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے معروضی زماں کے علاوہ اپنے باطنی وقت کا بھی شعور رکھتا ہے ۔ یہ باطنی وقت احساسات کے قضیوں سے دوسروں اور مکاں (معروض) کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ وہ ان قضیات کے حوصلے اور امید پر خود کو اس عالمِ بیگانہ سے جڑا ہوا اور محفوظ تصور کرتا ہے ۔ اسے شعوری و لاشعوری طور پر ہر لحظہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ عدم کی گھٹا ٹوپ اتھاہ گہرائیوں میں گرنے والا ہے اور جونہی ان رسیوں میں سے کوئی رسی، جس سے وہ خود کو بندھا ہوا تصور کرتا ہے، ٹوٹتی ہے تو دکھ والم اور فنا کے جبر کا شدید احساس اسے گھیر لیتا ہے۔اسی دکھ و الم اور فنا کے جبر کی تصویر پیش کرتی امجد اسلام امجد کی نظم ’’ محسن کے لیے ایک نظم ‘‘ سے مندرجہ ذیل اقتباس ملاحظہ ہو:

موت برحق سہی، موت لازم سہی

پھر بھی اپنے کسی رشتۂ درد کو ٹوٹتے دیکھنا

عمر بھر کی شناسا محبت بھری

دو چمک دار آنکھوں کو بجھتے ہوئے دیکھنا

اور ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہاتھ کی نبض کو

ایک بے رنگ لمحے کے پاتال میں ڈوبتے دیکھنا

کتنا سنگین ہے، کتنا دشوار ہے!

اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ہے

کہ یہ تجربہ ، موت سے بھی زیادہ پراسرار ہے

میں نے دیکھا اُسے

موت کی سیڑھیاں اترتے ہوئے

ریزہ ریزہ عدم میں بکھرتے ہوئے

جب ابھی اُس کی آنکھوں میں پہچان تھی

دل میں دھڑکن بھی تھی

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

بات سننے سمجھنے کے آثار بھی اُس کے چہرے پہ تھے

پھر بھی کوئی کہیں سے مسلسل یہ کانوں میں

سرگوشیاں سی کیے جا رہا تھا

''کہ وہ اب نہیں ہے''

کسی پیارے رشتے کے بارے میں یہ سوچنا بھی

کہ اب اُس کی میعاد پوری ہوئی

ایسا احساس ہے

جس کی تفہیم تو دور کی بات ہے

جس سے آنکھیں ملانا بھی ممکن نہیں

مُٹھیوں سے پھیلتی ہوئی ریت کو جس طرح

ہاتھ میں روک لینا بھی ممکن نہیں--- (10)

فنائیت کے اس ذاتی احساس کے علاوہ فرد کے ہاں اپنے رشتہ داروں ، عزیزواقارب اور دوستوں کی موت پر بھی غم، افسوس اور اضطراری کے احساسات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فرد معاشرتی اکائی ہے جو خاندانوں کی صورت میں رہائش پذیر رہتا ہے۔ اس مل جل کر رہنے اور باہمی لین دین اور تعاملات کی وجہ سے وہ اپنے ارد گرد کے لوگوں سے مانوس ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی جذباتی اور فطرتی تسکین کے لیے دوسروں پر انحصار کرتاہے ۔ وہ اپنی زندگی کے اس خالی پن کو رشتوں سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے، مگر جب ان میں سے کسی کو موت آن دبوچ لیتی ہے تو اس کے اندر کا خالی پن پھر سے واضح ہوجاتا ہے۔ اس کی جذباتی سطح اس کا اثر قبول کرتی ہے اور وہ دکھ کے گہرے پانیونمیں اترتا چلا جاتا ہے۔غلام جیلانی اصغر اسی دکھ اور افسوس کا اظہار اپنی نظم '' نوحہ '' میں یوں کرتے ہیں:

کبھی کبھی یہ ہوتا ہے!

ایک ہی شخص کے مر جانے سے

آدھی دنیا مر جاتی ہے

پھول اور پنچھی۔ چاند اور تارے

آنکھ کی جیوتی۔ نیر سے موتی

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہونٹوں کی مسکان کا چندن

سرما کی راتوں کا جادو

باتیں، جن کی کڑواہٹ میں شہد کا میٹھا پن ہوتا ہے!

باقی کیا رہ جاتاہے؟

آنکھوں میں خوابوں کی تلچھٹ

اجڑے اجڑے پیڑ خزاں کے

سہمی سہمی ان کی شاخیں

بکھری بکھری پھول کی کلیاں

ڈرتی ڈرتی شہر کی گلیاں

ایک اداس گھنیری چپ چپ

دن کا شور اور رات کی بوجھل تنہائی

باقی کیا رہ جاتا ہے؟ (11)

انسان بطور حیاتیاتی وجود، زندگی سے زندگی پاتا ہے اور دیگر جانداروں کی طرح ابتدائی عرصہ اپنے سے پہلے افراد(والدین) پر انحصار کرتا ہے اور ان سے مانوس ہوتا ہے۔ وہ احساساتی اور جذباتی سطح پر اپنے والدین، بہن بھائیوں ، رشتہ داروں سے جڑا ہوتا ہے۔ اس کے تجربات اور یادوں میں ان کا حصہ موجود ہوتا ہے۔ وہ اپنے ارد گرد کے ماحول اور ان افراد سے ابتدائی شعور، وسائل ، نظریات،زبان اور دیگر معلومات حاصل کرتا ہے۔ اس کی زندگی(حال اور ماضی) میں ان کا حصہ بہت زیادہ ہوتا ہے، وہ اپنی فطرت اور جذبات کے سبب اپنی شریکِ حیات اور اپنے بچوں سے بھی جڑا ہوتا ہے۔ لہٰذا جب ان میں سے کوئی سوئے عدم روانہ ہو تا ہے اور اسے داغِ مفارقت دے جاتا ہے تو اس کا باطنی جہان اس واقعے کا گہرا اثر قبول کرتا ہے اور جذباتی سطح پر اسے ایک ایسے خلا کا سامنا ہوتا ہے جس کو فقط وہی وجود پورا کر سکتا ہے ۔ ماضی فرد کی داخلی سچائی ہے جو اس کی ذات کے اندر پیوستہ ہوتی ہے۔ لہٰذا فرد کے ہاں یاسیت اور لاحاصلی کے ملے جلے احساسات اور کیفیات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ انہی احساسات کی عکاسی اظہر جاوید کی نظم ’’ کون بتائے ‘‘میں دیکھنے کو ملتی ہے:

مائیں کیوں مر جاتی ہیں

شفقت، رحمت، برکت والے

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

پیار کے گھر میں

سکھ آنگن میں

چاہت سے مہکے گلشن میں

پت جھڑ کیوں بھر جاتی ہیں

مائیں کیوں مر جاتی ہیں (12)

زیست کے اس دشتِ بلا میں ماں ایسا گھنا سایہ دار درخت ہے جس کی چھاؤں صدیوں کی لاحاصل مسافرت کی تھکن لمحوں میں اتار دیتی ہے۔ جدید ریسر چ کے مطابق ماں کے ساتھ بات چیت ذہنی تناؤ میں کمی کا باعث ہے۔ یہ وہ ہستی ہے جو شجر کی طرح خودزمانے کی کڑی دھوپ برداشت کرتی ہے مگر اپنی اولاد کو اس تپش اور حدت سے محفوظ رکھنے کی ہمت رکھتی ہے۔ لہٰذا جب فرد ایسی شفیق اور محبوب ہستی سے بچھڑتا ہے تو اس کی باطنی دنیا میں ہیجان برپا ہوجاتا ہے اور اس کا باطنی جہان اس زلزلے کی زد میں توڑ پھوڑ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ’’ ماں کے لیے نظم بنامِ خدا ‘‘ میں سیّد مبارک شاہ اسی المیے اور صدمے کاا ظہار یوں کرتے ہیں:

اے خدائے زندگانی!

مجھے تجھ سے عمرِ فانی

کا گلہ نہیں ہے لیکن

ہے اسیرِ جاودانی

مرا جسم گل رہا ہے

مری جاں چلی گئی ہے

مجھے ڈھونڈ دے کہیں سے

وہ کہاں چلی گئی ہے

مجھے اس کے پاس لے جا

وہ جہاں چلی گئی ہے

اے خدائے زندگانی

تو ازل ازل کا تنہا

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

میں ابھی ہوا ہوں تنہا

ترے المیے سے اب کے

مرا سانحہ بڑا ہے

مرا درد لادوا ہے

مرے سر سے دوپہر میں

تری چھاں چلی گئی ہے

اے خدائے زندگانی!

مری ماں چلی گئی ہے (13)

موت کی ناگہانیت دہری صفت کی مالک ہے۔ جہاں ایک طرف موت کا تصور وجود کو اپنے امکانات سے چناؤ کرنے کے اہل بناتا ہے اور دوسری طرف اسے ابدی کرب کے ان داخلی ذائقوں سے روشناس کرواتا ہے جن سے فرار حاصل کرنا ناممکن ہے ۔ کرکیگارڈ کے نزدیک داخلیت وجود کی سب سے بڑی اور اہم قدر ہے۔ چنانچہ جس قدر گہرائی کے ساتھ فرد اپنی موت کے امکان اور ناگہانیت پر غور کرے گا اتنی ہی تیزی سے وہ اپنے چناؤ کے عمل سے گزرے گا۔ اس کے فی الوقتی اور حالیہ امکانات میں موت کا امکان ہمیشہ موجود رہتا ہے، لہٰذا موت کا شعور اسے دعوتِ عمل دیتا ہے اور اس قابل بناتا ہے کہ وہ جلد از جلد انتخاب کے عمل سے گزرے۔ یوں ہر وقت وہ اپنے انتخاب کے عمل کو تیز بنانے کی کوشش کرتا ہے تاکہ موت سے قبل وہ اپنی چاہت اور خواہش کو عملی جامہ پہنا سکے۔ اس تصویر کے دوسرے رخ پر موت کا وہ احساس کھڑا ہے جو وقت بیتنے کے ساتھ مزید گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ ہر فرد اپنے ذہن میں اپنے لیے ایک ممکنہ حد کا تصور تشکیل دیتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے دورانیے کے لیے ذہنی سطح پر ایک حد مقرر کرتا ہے اور جوں جوں اس کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے ، فنا کے احساس تلے دبتا چلا جاتا ہے۔ بڑھاپے کی علامات کے ساتھ ہی اس کا سست ہوتا اعصابی نظام اور ضعف اسے موت کی یاد دلاتا رہتا ہے اور جوں جوں فرد عمر کے اگلے مرحلے میں قدم رکھتا ہے، اس کے چہرے پر فنا کے احساس کی زردی مزید واضح ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کی مہلت ختم ہونے والی ہے اور یہ ناگہانی موت اسے مزید ایک لمحے کی بھی مہلت عطا نہیں کرے گی۔مستنصر حسین تارڑ موت کی اسی بے ثباتی اور نا گہانیت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اپنی نظم ’’ موت کچھ توقف کر ‘‘ میں یوں کرتے ہیں:

مت دستک دے

ٹھہر، ابھی میرے چہرے پر سرسوں کا زرد کھیت نہ بچھا

میری بجھتی ہوئی آنکھوں کو یوں نیم وا نہ کر کہ وہ بند نہ ہوں

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اور اُن پر کوئی ہتھیلی بچھ کر اُنہیں ہمیشہ کے لیے بند نہ کر دے

ٹھہر، اتنی بے صبر نہ ہو موت، منتظر موت

دستک مت دے بدن کے سالخوردہ کواڑوں پر

یہ تیرے ایک لمس سے بھُر جائیں گے، خاک نشیں ہو جائیں گے

قضا تجھے عادت نہیں ہے پر کچھ تو توقف کر لے

عطا کردے ذرا سی مہلت

میں نے ابھی کچھ کام کرنے ہیں--- (14)

موت کا قنوطی تصور اور لغویت فرد کو ان اندھیروں سے روشناس کراتی ہے جہاں امید کا کوئی جگنو ، کسی خواب کی روشنی اور فرار کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ موت کا یہ تصور جب فرد کو اپنے شکنجے میں جکڑتا ہے تو عموماً وہ عمل کا قائل نہیں رہ پاتا۔ فنا کے اس تصور کے ساتھ لا یعنیت کا شیڈ جس نئے رنگ کو تشکیل دیتا ہے ، وہ فرد کو دنیا کی ہر چیز میں نظر آنے لگتا ہے۔ تو کیا؟ پھر کیا ہوگا؟ کیا حاصل؟ جیسے سوالات اس سے زندگی میں آگے بڑھنے اور کچھ کرنے کی صلاحیت سلب کر لیتے ہیں۔ وہ جان لیتا ہے کہ یہاں ہر رنگ پھیکا ہے، ہر ذائقہ وقتی ہے اور گُل کا گُل خستہ جاں اور عارضی ہے۔ وہ زندگی کی ان تلاطم خیز موجوں میں جس بھی چیز کو پکڑ کر ڈوبنے سے بچنے کا سہارا بنائے گا وہ خود بھی اس کے ساتھ ہی بہہ جائے گی۔مشیّت اور نیستی کا یہ سمندر تمام عالم نگل جائے گا۔ کہانی کے کردار، کہانی، کہانی کہنے والے اور کہانی سننے والے ، کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔ وقت ہستی کے اسباب کے ساتھ ساتھ ہستی کے نشانات بھی مٹاتا چلا جاتا ہے اور تصویر اور مصور دونوں یوں مٹ جاتے ہیں جیسے ہونا نہ ہونا دونوں ایک برابر ہیں۔فنا کے اسی کربناک اور الم ناک تصوّرکو روش ندیم نے اپنی نظم '' ایک مصور کی کہانی جسے اس کی تصویر نے بنایا تھا '' میں اس خوبصورت اور مؤثر میں بیان کیا گیا ہے کہ قاری فنا کے اس دل سوز احساس کو اپنی روح کی گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ نظم سے اقتباس ملاحظہ ہو :

---میں نے کتنا بنایا

تم کتنا بنی

پتہ نہیں----

پتہ نہیں اس کا انت بھی ہے کہ نہیں

کہ اس بناؤ کی تکمیل

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

مصور اور تصویر دونوں کی موت ہے (15)

فنائیت کے اسی احساس کو اجاگر کرتی ، افتخار بخاری کی اس نظم '' چلنے اور رکنے کے درمیان'' میں بھی زیست کی عارضیت اور فرد کو لاحق فنا پذیری کے احساس کواس انداز میں لفظوں کے قالب میں ڈھالا گیا ہے:

میں سمٹتا ہوں

میں بکھرتا ہوں

میں فقط ایک وقفہ ہوں

رکنے اور چلنے کے درمیان

جینے اور مرنے کے درمیان

میں ایک آہٹ ہوں

ناقابلِ شنید

مہین پل کے لیے

رات بظاہر بے کنار ہے

پھر بھی میں سر کو اٹھاتا ہوں

آسمان پر ستاروں کی مخفی تحریر

اچانک مجھ پر مسکراتی ہے

اور انجانے میں

میں جان جاتا ہوں

کہ مجھے لکھا گیا

مٹنے کے لیے (16)

وجود کے نزدیک وقت کے ساتھ فنا کااحساس جڑا ہوا ہے۔ بہت کم لوگ وقت کے سائنسی نظریات کا علم رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود ہر ذی شعور کسی نہ کسی نسبت سے وقت کا شخصی وذاتی ادراک حاصل کرتا ہے۔ فرد کے ہاں وقت کے ساتھ تبدل اور شکست و ریخت کا تصور جڑا ہوتا ہے ، وہ اشیا کے تغیرو تبدل اور ان کی شکست و ریخت اور فنا سے اس کی مشاہداتی تفہیم حاصل کرتا

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

ہے۔ وہ اپنی اور دوسرے جانداروں کی حیاتیاتی تبدیلیوں سے اپنے ماضی کا احساس رکھتا ہے، جس میں گردو پیش ، معروض اور وجود بذاتِ خود کی نسبتوں سے وہ اپنے آگے گزر جانے اور تبدل کا شعور حاصل کرتا ہے۔ وہ مشاہد کی طرح دوسروں کے تبدل اور تحرک کا مشاہدہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے حرکت کرتے کسی وجود کی حرکت کا اندازہ دیگر چیزوں کی نسبت سے ہوتا ہے، مگر یہ بھی ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ حرکت کے سب سے چھوٹے وقفے پر ہر متحرک چیز مشاہداتی سطح پر رکی ہوئی ہوتی ہے لیکن حرکت کے ان قوانین کے برعکس حالتِ وقت کی تفہیم ایک پیچیدہ عمل ہے کیوں کہ اس میں مشاہد سمیت ہر نسبت اور ہر چیز جس کو زیرِ مشاہدہ رکھا گیا ہو، سب کچھ تحرک یعنی شکست و ریخت اور تبدل کا شکار ہوتی ہیں۔ جس کے سبب معروض کا پہیا آگے بڑھتا رہتا ہے اور مشاہد خود بھی ان معروضی اور داخلی محرکات کے زیرِ اثر مسلسل تبدل کا شکار رہتا ہے۔وقت کی اسی روانی اور اس کے زیرِ اثر مسلسل تغیّر و تبدل کے شکار فرد اور اس کی وہ کائنات جس سے وہ داخلی بنیادوں پر جڑا ہوتا ہے ، میں ہونے والے بدلائو اور شکست و ریخت کے عمل کی تصویر پیش کرتی نصیر احمد ناصر کی نظم ''سرمئی بارش میں بحرِابدیت کی جانب''سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

---اور بچے کمروں میں

اندھیرے کی لوری سن کر

جھوٹ موٹ آنکھیں بند کر لیتے ہیں

اور خدا اور باپ دونوں تنہا ہوتے ہیں

جو غیر مرئی اونگھ میں بھی جاگتے رہتے ہیں

دکھائی نہ دینے والے آنسوؤں کی چاپ

سنائی دیے بغیر آتی رہتی ہے

اور پانی بند کھڑکی کے شیشوں پر

بے آواز گرتا چلا جاتا ہے

اور بارش ہوتی رہتی ہے

دیر تک اور دور تک

اور ایک درد کا دریا

بحرِ ابدیت کی جانب بہتا رہتا ہے

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

اور زمانے گزرتے چلے جاتے ہیں

آتش دان کے پاس

جھولا کرسی (راکنگ چیئر) پر

کوئی جھولتے جھولتے سو جاتا ہے! (17)

شاعر بطور حساس فرد کے اپنے عہد کے سماجی و سیاسی حالات سے گہرا اثر قبول کرتا ہے اور لاشعوری اور شعوری طور پر اسے اپنی تخلیقات کا حصہ بناتا ہے۔ اکیسویں صدی کے عصری و معراضی حالات نے فرد کی شعوری و لا شعری سطح کو بری طرح جھنجھوڑا ہے نائن الیون کے عالمی اثرات، دہشت گردی، قدرتی آفات و بلیات (زلزلے، سیلاب اور حالیہ کرونا) جیسے حالات و محرکات کے زیرِ اثر یہاں بسنے والوں کے ہاں خوف، دہشت، بے چینی، الجھن اور کرب جیسی کیفیات دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ان سب عوامل نے مل کر پاکستانی معاشروں میں بسنے والے افراد کی نفسیاتی و احساساتی سطح کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکیسویں صدی کی نظم میں پاکستان کے عصری حالات کی عکاسی کرتے ہوئے شعرا کے کے ہاں دہشت گردی، خود کش دھماکہ، چیتھڑے اڑنا، مسخ لاشیں، بے کفن اور موت جیسے الفاظ کا استعمال بکثرت دیکھنے کو ملتا ہے۔ موت اور فنائیت کا اظہار اکیسویں صدی کی نظم کا بنیادی موضوع ہے۔ اس ضمن مینانوار فطرت کی نظم '' بزن ''،'' ایک مہذب لاش کا قتل'' ، '' موت کا کھیل '' از اشفاق سلیم مرزا، ـ'' ہزارہ قبیلے کا نوحہ''، ارشد معراج، ملبے سے نئی دنیا نکلتی ہے'' از شہزاد نئیر،حفیظ تبسم کی نظم ''گناہ گار شاعر کی بے گناہ نظمیں ''،قراۃ العین فاطمہ کی نظم '' ایک دن مجھے مار دیا جائے گا''،سعود عثمانی کی نظم '' ۲۳ جنوری ''، صدیق عالم کی نظم '' ؟ ''، ''کاش ، اے کاش''از جون ایلیا، '' اب کون ہمیں دیکھے '' امجد اسلام امجد ، '' ہجوم ہٹ نہیں رہا۔'' از عدنان محسن۔، '' مبارک باد '' از صائمہ اسماء ، ـــ'' سونامی سے ایک مکالمہ'' از ایوب خاور،'' زلزلے سے پہلے کی داستان '' از عنبر شاہد اور ''ذرا سے وائرس نے'' از جلیل عالی سمیت بے شمار ایسی نظمیں اس زمانی حدود میں لکھی گئی جن میں فنائیت اور موت کی موضوعاتی پیشکش دیکھنے کو ملتی ہے۔

حواشی

1. Blaise, Pascal. "Pensees". Trans. A.J. Krailsheimer. London: Penguin Books, 1995. P-37.

2. Beauvoir, Simone De. "A very easy death". New York: Pantheo Publishers, 1985. P-100.

3. Heidegger, Martin. "Being and Time". Trans. John Macquarrie and Edward Robinson. London: Penguin Books, 1962. P-103.

4. Kaufman, Walter. Eds. "The Portable Nietzsche". London: Penguin Books, 1976. P-138.

Vol.4No.1 2021
ISSN Online: 2709-7625
ISSN Print: 2709-7617

5. Nietzsche, Friedrich. "Thus spoke Zarathustra". Trans. R.J. Hollingdale. London: Penguin Books, 1969. P-99.

۶۔ ستار سید،''موت قاصد کی طرح آتی ہے''،مشمولہ:فنون، سہ ماہی، شمارہ ۱۱۲،لاہور:میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ، جون تا جنوری ۲۰۰۰، ص۱۰۳۔

۷۔ سعید اختر درانی، ڈاکٹر،''غبارِ کہکشاں''،لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۲، ص۲۲۴۔

۸۔ منیب الرحمن،''سڑکوں کے چراغ''،کراچی:شہر زاد مطبوعات،۲۰۰۵، ص۱۵۔

۹۔ شمامہ افق،''موت تمہارے اندر ہے''،مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱،جہلم:بک کارنر،اپریل۲۰۱۷ء، ص۲۵۰۔

۱۰۔ امجد اسلام امجد،'' محسن کے لیے ایک نظم''،مشمولہ:تسطیر، کتاب ۲،جہلم:بک کارنر،اگست۲۰۱۷ء، ص۱۹۵۔

۱۱۔ غلام جیلانی اصغر،''نوحہ''،مشمولہ:ادبیات، سہ ماہی ،جلد ۱۲،شمارہ ۵۱،۵۲،اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان، بہار، گرما۲۰۰۰، ص۲۰۰۔

۱۲۔ اظہر جاوید،''غم عشق گر نہ ہوتا''،لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳، ص۱۱۷۔

۱۳۔ سید مبارک شاہ،''ماں کے لیے ایک نظم بنامِ خدا''،مشمولہ:فنون، سہ ماہی ، شمارہ۱۱۲،لاہور:میاں چیمبرز ۳ ٹمپل روڈ، جنوری تا جون۲۰۰۰، ص۱۱۵۔

۱۴۔ مستنصر حسین تارڑ،''موت کچھ توقف کر''،مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱،جہلم:بک کارنر،اپریل۲۰۱۷ء، ص۱۴۷۔

۱۵۔ روش ندیم،''ایک مصور کی کہانی جسے اس کی تصویر نے بنایا تھا''،مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱،جہلم:بک کارنر،اپریل۲۰۱۷ء، ص۱۹۲۔

۱۶۔ افتخار بخاری،'' رکنے اور چلنے کے درمیان''،مشمولہ:تسطیر، کتاب ۲،جہلم:بک کارنر،اگست۲۰۱۷ء، ص۲۱۲۔

۱۷۔ نصیر احمد ناصر،''سرمئی بارش میں بحرِ ابدیت کی جانب''،مشمولہ: تسطیر، کتاب ۱،جہلم:بک کارنر،اپریل۲۰۱۷ء، ص۲۷۵۔